میر گل خان نصیر کی اُردو شاعری کا قومی وانقلابی پہلو

[1]طارق عزیز بلوچ

Abstract:

Mir Gul Khan Naseer is one of those great names who worked hard in introducing Urdu poetry Balochistan. As Mir Gul Kahn Naseer has the title of "Malik u Shura" in Balochi poetry he is also the top tanked poet of Urdu in Balochistan. With his creative power he made the Balochi people aware of beauty of Urdu poetry. He added a color of Balochi culture in Urdu poetry and entered the group of people who struggled to spread Urdu in Balochistan.

In this paper, I have reviewed technical aspects of Mir Gull Khan Naseer's Urdu poetry. With this paper the beauty of his poetry as a sample, Urdu can be promoted in Balochistan.

Keywords: **Mir Gul Khan Naseer, Noshki, Balochistan, Epic, Urdu Poetry, Barahvi.**

کلیدی الفاظ: میر گل خان نصیر، براہوی، نوشکی، بلوچستان، اردو شاعری، انقلابی شاعری

سرزمین بلوچستان کو خدا نے ہر طرح سے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ یہ زمین خزانوں کی زمین ہے۔ بلوچستان کی سرزمین نہ صرف معدنیات کے حوالے سے ذرخیز ہے بلکہ یہ ایک مردم خیز خطہ بھی رہا ہے۔ بلوچستان کے سرحدی علاقے ضلع نوشکی کی خاک نے ایسے گوہر نایاب جنم دیے ہیں کہ جن کی چمک سے قوم کا مستقبل روشن رہا ہے۔ اسی سرزمین سے نامور بلوچ محقق، شاعر، سیاستدان، قبائلی رہنما اور ہمہ جہت شخصیت میر گل خان نصیرؔ میں پیدا ہوئے۔ میر گل خان نصیرؔ نے نوشکی کے ایک گاؤں کلی مینگل میں ذگر مینگل قبیلے کے ایک سربراہ میر حبیب خان مینگل کے گھر آنکھیں کھولیں۔ (۱) ابتدائی تعلیم کا سلسلہ گاؤں سے شروع ہوا اور پھر مستونگ اور کوئٹہ سے ہوتے ہوئے آپ نے لاہور کا رُخ کیا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ آنکھ میں چنگاری پڑھنے کی وجہ سے رشتۂ تعلیم منقطع ہو گیا اور وہ ادھوری تعلیم کے ساتھ دوبارہ

---

1 ایم فل اسکالر، شعبۂ اُردو واقبالیات، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

بلوچستان گئے۔[۲] بائیس برس کی عمر میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ دو بچیوں کے باپ بنے تاہم اولاد نرینہ سے محروم رہے۔ معاش کا مسئلہ درپیش آیا تو انھوں نے وزیر اعظم قلات کے دفتر میں مستوفی کے عہدے پر کام کیا، پھر مکران میں کسٹم آفیسر کی ذمہ داری بھی ادا کی۔ لاہور کے قیام کے دوران حالات کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے رہے اور اس مشاہدے نے مزاج میں صحافت کے شوق کو پروان چڑھایا۔ ہفت روزہ ''استقلال'' سے صحافت کا آغاز کیا اور پھر ''نوائے بلوچستان'' کے ایڈیٹر بنے۔[۳] صحافت میں اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت کم وقت میں شہرت حاصل کی لیکن ان کی شہرت اربابِ اختیار کو پسند نہ آئی اور بہت جلد ہی ان کو کمیونسٹ کہہ کر ان پر ایک مقدمہ گھڑ لیا گیا۔

میر گل خان نصیرؔ پیدائشی شاعر تھے۔ شاعری ان کے خمیر میں رچی بسی تھی۔ چھوٹی عمر سے ہی براہوئی زبان میں مصرعے موزوں کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انھیں طویل بلوچی نظموں کو زبانی یاد کرنے کا شغف تھا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے سے پہلے ہی انھوں نے براہوئی زبان میں قومی، رزمیہ اور عشقیہ کلام لکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔[۴] نا صرف بلوچی، براہوئی بلکہ فارسی اور اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے۔ ان کا پہلا اُردو شعر آج بھی بلوچستان میں زبانِ زدِ عام ہے:

آ گیا وقتِ امتحانِ بلوچ
اب ہے کچھ اور آسمانِ بلوچ[۵]

میر گل خان نصیرؔ ادب اور ادبی محفلوں سے لگاؤ رکھتے تھے۔ بلوچی 'زبان وادب' نامی تنظیم سے ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور اس کے پہلے صدر بنے۔ غلام محمد اور عبداللہ جان کی صحبت نے شخصیت پر ادبی رنگ چڑھایا۔

میر گل خان نصیرؔ زمانہ طالب علمی سے ہی سیاست اور سیاسی معاملات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ قیامِ لاہور کے دوران انھوں نے مختلف تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لاہور سے واپسی پر اہلِ وطن کی بدحالی اور غیر ملکی آقاؤں کی سرمستیاں ناقابل برداشت محسوس ہونے لگیں تو انھوں نے سیاست میں عملی طور پر حصہ

لینے کا فیصلہ کیااور ''انجمن اتحاد بلوچستان'' میں شامل ہوئے۔اس کے بعد وہ ''انجمن اسلامیہ قلات'' کے جنرل سیکرٹری رہے،(۶)''قلات اسٹیٹ پارٹی'' میں بطور نائب صدر خدمات سرانجام دیں اور قیام پاکستان کے بعد بلوچستان نیشنل پارٹی کی نشست سے سینئر وزیر کی حیثیت سے سماجی بہبود، تعلیم، صحت اور بلدیات کا قلمدان سنبھالا۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔انھوں نے اپنی زندگی کے پچاس سال سیاست کے لیے وقف کیے۔اصولوں کے پابند یہ بزرگ سیاستدان اور دور اندیش شاعر ۱۹۸۳ء میں علیل ہوگئے اور پھیپھڑوں کے کینسر نے انھیں جکڑ لیا۔(۷)ہر طرح سے علاج کے باوجود بھی وہ جانبر نہ ہوسکے اور ۶ دسمبر ۱۹۸۳ء کی رات جان جاں آفرین کے سپرد کر کے اس دنیا سے رخصت ہو کر آبائی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انھیں ''ستارہ امتیاز'' سے نوازا۔

بلوچستان کا نام سنتے ہی ذہن کے دریچوں پر سنگلاخ چٹانوں کی تصویر اُبھرنے لگتی ہے۔بے آب و گیاہ میدان اور تپتے صحراؤں میں پسینوں سے شرابور جسموں کا خیال آنے لگتا ہے۔بولان کے پُرپیچ راہوں کی ہیبت اور ان راہوں سے گزرتے قافلوں کے قدموں کی چھاپ سنائی دیتی ہے۔لیکن انہی کارروانوں کے قدموں کی آوازوں کو اگر غور سے سننے کوشش کی جائے تو ایک اور آواز ''کارواں کے ساتھ'' کی ہے۔یہ وہ آواز ہے جو کارواں کے ساتھ ہے اور اگر کارواں کبھی سست رفتار پڑ جائے تو یہ آواز ہمت بڑھانے لگتی ہے اور پھر سے انھیں آمادہ سفر کرتی ہے۔یہ چلتن و شاشان کے شیدائی میر گل خان نصیرؔ کی آواز ہے جو اپنے اُردو و فارسی مجموعہ کلام ''کارواں کے ساتھ'' میں قوم کی رہبری کا فریضہ سرانجام دیتے نظر آتے ہیں۔میر گل خان نصیرؔ نے فارسی، براہوئی اور بلوچی کے ساتھ جب اُردو شاعری کے دامن میں آئے تو یہاں ان کے فن کی عظمت کا اعتراف کیا جانے لگا۔مقصد کی دھن میں مست، فلاح و بہبود کے جذبے سے سرشار میر گل خان نصیرؔ جب ترقی کے پُرخار راہوں پر قوم کی راہنمائی کرنے لگتے ہیں تو اس وقت وہ فن کی چوٹی پر کھڑے نظر آتے ہیں۔وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں تاہم دیگر اصنافِ شاعری خصوصاً غزل گوئی سے بھی تعلق قائم رہا۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب تک غلاموں نے زنجیروں سے پیار کیا ہیں اور بیڑیوں کا بوسہ لیا ہیں تب تک زنجیروں کو توڑنے والا کوئی بھی پیدا نہیں ہوا۔ کبھی کبھی غلامی کی شب تاریک اس لیے بھی طویل ہوتی ہے کیوں کہ غلام قوم کی طرف سے طوقِ غلامی کو گلے سے نکالنے میں سستی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ وقت کی رفتار اور عصر کی آواز پر جن لوگوں نے دھیان نہیں دیا ان کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ حالات کی سنگینی اور ظلم کی سیاہ رات نے گل خان نصیرؔ کو چین کی نیند سونے نہ دیں۔ انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ قوم ''افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو بھی رہے ہیں''، کی عملی تصویر بنتی جا رہی تھی۔ میر گل خان نصیرؔ قوم کی سمت کا تعین، شعور کی بیداری اور بطور قوم تربیت کے خواہش مند تھے۔ وہ ایک دیوار سے لگی ہوئی، کسمپرسی کی ماری بے سمت قوم کی رہنمائی کے فرائض سرانجام دینے کی لگن رکھتے تھے۔ وہ خواب خرگوش میں مست ایک قوم کو بیدار مغز بنانا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر بلوچوں کو ان کے ماضی کے قصے اور اسلاف کے کارنامے یاد دلائے جائے تو یہ قوم دوبارہ اسی طاقت سے اٹھ کر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتی ہے۔ وہ بلوچوں کے لیے مشعل راہ بننے کی خواہش مند تھے۔ وہ بلوچوں کو ان کی منزل کا پتہ دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنی قوم کی حالت کو دیکھ کر خدا کے حضور دعا گو ہوتے تھے کہ خالقِ اکبر اس سے قوم کو بیدار کرنے کا کام لے۔ بلوچ قوم کی بے سر و سامانی اور اس پر قیادت کا فقدان دیکھ کر میر گل خان نصیرؔ خدا کے حضور دست دعا بلند کرتے ہیں اور ۱۰ نومبر ۱۹۳۶ء کی اپنی تخلیق میں لکھتے ہیں:

اے خالق اکبر مجھے توفیق عطا کر
غفلت سے بلوچوں کو ذرا پھر میں جگا دوں
کھو بیٹھے ہیں مردانِ سلف کی وہ روایات
پھر قصے ماضی کے انھیں یاد دلا دوں(۸)

ادب کو کسی بھی سماجی عمل کا حصہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ میر گل خان نصیرؔ بھی ادب کو سماجی عمل میں اہم جز کے طور پر مانتے تھے۔ سماج کے اندر جو بھی واقعات اور حالات موجود ہوتے ہیں وہ ادب اور شاعری کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔ اس بات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ میر گل خان نصیرؔ کی شاعری ان کے عہد کے رجحانات کی توسیع ہے۔ میر گل خان نصیرؔ کی شاعری میں ان کا عہد نظر آتا ہے۔ ان کی زندگی جن مقاصد

کی حصول کے لیے گزری ان میں سے بہت سے ان کی شاعری میں بھی شامل ہیں۔ میر گل خان نصیرؔ کا دور جبر اور استحصال کا دور تھا۔ غلامی کی زنجیریں مجموعی طور پر پوری قوم کے گلے میں تھیں۔ حق گوئی پر پابندی تھی اور بولنا جرم تھا۔ حق مانگنا گناہ کبیرہ بن چکا تھا۔ مظلوم کو ظالم کا چہرہ یاد نہیں رہتا تھا البتہ اس کو اتنا یاد رہتا تھا کہ وہ ایک ہی تلوار سے بار بار زخم کھا رہا تھا۔ اجتماعی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ ان سب پر افسوس یہ کہ لوگ ان تمام مصائب کو تقدیر کا لکھا مان کر خاموشی سے سہے جا رہے تھے۔ وہ ہر حکم کے سامنے بغیر کسی مزاحمت کے سر تسلیم خم ہوتے تھے اور ان کی یہ تقدیر پرستی سامراجی طاقتوں کو مزید تقویت پہنچا رہی تھا۔ 'تصویر زیست' میں میر گل خان نصیرؔ اس رویے کے بارے میں لکھتے ہیں:

لوگ کہتے ہیں کہ یہ تقدیر ہے
زندگی کی یہ بھی اک تصویر ہے(۹)

لیکن شعور کی دولت سے مالا مال میر گل خان نصیرؔ کے نزدیک یہ تقدیر قابل قبول نہیں تھی۔ وہ تو اس حالت کو قوم کی بے حسی کا نتیجہ مانتے تھے اس لیے انھوں نے قوم کو بیدار کرنا شروع کیا۔ جب ظلم حد سے بڑھتا ہے تو اس کا انجام آخر مٹنا ہی ہوتا ہے۔ یہ بات میر گل خان نصیرؔ اپنی قوم کو بھی سمجھانا چاہتا تھا۔ وہ قوم سے سوال کرتے ہیں کہ کاتب تقدیر نے تو ابد تک ان کی قسمت میں مصیبتیں تو نہیں لکھی ہے تو پھر یہ بلائے آسماں ان سے دور کیوں نہیں ہوتے۔ ظلم کا ہاتھ ہمیشہ ان کے گلے تک کیوں پہنچتا ہے؟ وہ پوچھتے ہیں کہ آخر کب تک قوم خاک نشین رہے اور اس کے رہبر قصرِ جمشیدی میں زندگی کے مزے اڑائیں؟ ان سے یہ بدحالی مزید برداشت نہیں ہوتی اور وہ قوم کے سامنے خطاب کرتے ہیں۔ یہ خطاب بہت ہی فکر انگیز ہے اور اس کے اندر پوچھے گئے سوالات دلوں کو گرمانے کی صلاحیت رکھتے ہیں:

رہیں گے ہم گرفتارِ بلائے آسماں کب تک
جلائیں گی ہماری جھونپڑی کو بجلیاں کب تک
میسر ہوں اُنھیں دیباکی اور اطلس کی پوشاکیں
لگائیں چیتھڑوں پر سوت کی ہم دھجیاں کب تک

رہائش کے لیے ان کی، بنے ہوں قصرِ جمشیدی
ہماری تیرہ بختی کے لیے ہوں جھگیاں کب تک(۱۰)

قوم کا یہ رہبر قوم کو یقین دلاتا ہے کہ اب جو کرنا ہے قوم کو ہی کرنا ہے اب زورِ بازو اور جوش ہی ہے جو اس مصیبت اور غلامی سے انھیں نجات دلا سکتے ہیں بصورت دیگر اسلاف کی یاد میں بیٹھ کر انتظار کرنا کہ ان میں سے کوئی آکر پھر سے ان کی حالت بدل دیگا تو یہ غلط فہمی ہے اور ایسی غلط فہمیاں پیغام نصیرؔی کا حصہ نہیں ہے۔ پیغام نصیریؔ تو حرکت و عمل ہے اور محنت سے عبارت ہے:۔

بھروسا تم کو کرنا چاہیے اب زور بازو پر
یہ لاحاصل حکایات اور یادِ رفتگاں کب تک
یہ پیغامِ نصیریؔ ہے، اٹھو گر جوش ہے تم میں
غلامی کی مصیبت میں رہو گے نیم جاں کب تک(۱۱)

آزادی کے بعد بھی جب قوم کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تو ایسے موقع پر ہمت ہارنے کی بجائے وہ ایک اعتماد کے ساتھ قوم کو ترغیب دینے لگے کہ ظلم کی رات جتنی تاریک اور لمبی کیوں نہ ہو اس کا نتیجہ آخر ایک روشن صبح ہی ہے۔ جس طرح سے انگریز سامراج کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا اسی طرح سے وقت کے موجودہ خداؤں کو بھی ایک نہ ایک دن اوندھے منہ گرنا پڑے گا۔ وہ اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ دنیا کی روایت یہی رہی ہے کہ ظالم کے دن زیادہ نہیں ہوتے۔ اقدار کا بدلنا ایک لازمی امر ہے۔ یہ خیال کہ غلامی ہمیشہ کے لیے ان کے مقدر میں ہیں یہ ایک وہم ہے۔ میر گل خان نصیرؔ اپنی قوم کو سمجھاتے ہیں کہ دنیا کی زندگی میں تبدیلی ایک لازمی امر ہے اس لیے تبدیلی سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تبدیلی نیک شگون ہے اور اس کے لیے تیار ی ضروری ہے۔ ''گھبراؤ نہیں'' نظم جو انھوں نے ۱۹۴۹ء میں لکھی ہیں اس کے اشعار ملاحظہ ہوں:

دنیا کی پرانی ریت ہے یہ گھبراؤ نہیں، پچھتاؤ نہیں
طوفانوں سے جھک جاؤ نہیں، ان نغموں سے بل کھاؤ نہیں
یہ قدریں یونہی بدلتی ہیں، ان قدروں سے ڈر جاؤ نہیں
ہستی میں تغیر لازم ہے، تبدیلی سے گھبراؤ نہیں

یہ وہم کے دھندلے سائے ہیں، ان دھوکوں سے گھبراؤ نہیں
ہم رنگِ زمیں یہ دام تو ہیں، ان داموں میں پھنس جاؤ نہیں
یہ دھندلے نقش پرانے ہیں، ان نقشوں پر اتراؤ نہیں
اب ان کو مٹادو صاف کرو، اے دوست کبھی کتراؤ نہیں (۱۲)

میر گل خان نصیرؔ قوم کو یقین دلاتے ہیں کہ آقاؤں کی جی حضوری کی اب مزید گنجائش نہیں رہی ہے۔اب خوشی کے گیت صرف امیر طبقے کے لیے ہی نہیں بلکہ غریب کی خوشحال زندگی کے لیے بھی گائے جائے گے۔یہ پرانے اقدار جن کے بوجھ تلے قوم دب رہی ہے اب ان کو پامال کرنے کا وقت آگیا ہے۔وہ قوم کو ترغیب دیتے ہیں کہ جس بلند و بالا محل نے ان کے سر سے چھت چھینا تھا اب اسی کی اینٹوں سے ان کے لیے مکان تعمیر کرنے کا وقت آگیا ہے۔میر گل خان نصیرؔ کی یہ اندازِ رہنمائیِ قوم، اقبال کے رنگ کے قریب ہے۔ اقبال نے اپنی نظم ''خدا کا فرمان فرشتوں سے'' میں جن خیالات کو پیش کیا ہے ایسے ہی خیالات و نظریات میر گل خان نصیرؔ کی نظم ''گھبراؤ نہیں'' میں ملتے ہیں۔بلکہ میر گل خان نصیرؔ تو مزید ایک قدم آگے بڑھ کر ''آموزشِ آدمِ نو'' کے لیے ایک نئی دنیا، ایک الگ جہاں بنانے کی بات کرتے ہیں اور رزم و بزم کے انداز بھی بدلنا چاہتے ہیں۔انھیں اب ان پرانے نقشوں سے وحشت سی ہونے لگی ہیں اور اب وہ ان کو مزید قوم کے لیے برداشت نہیں کرتے اس لیے قوم کو بیدار کر کے کہتے ہیں یہ نقوش کے بدلنے سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اب وقت ہے کہ بیدار ہو کر وقت کی صدا پر لبیک کہا جائے:

تعمیر جہانِ نو کے لیے یہ نقشِ کہن برباد کرو
آموزشِ آدمِ نو کے لیے اک تازہ جہاں آباد کرو
بوسیدہ، شکستہ قدروں کو پامال کرو، برباد کرو
اک تازہ تصور لے کے اٹھو اور فکر و عمل آزاد کرو
آقاؤں کے بندھن توڑ کے اب مزدور کا جیون شاد کرو
مالک کے محل کی اینٹوں سے دہقان کا گھر آباد کرو
اب لے کے اٹھو آئین نیا، دستورِ کہن برباد کرو

اب رزم میں ہو یا بزم میں ہو اک طرز نیا ایجاد کرو
گھبراؤ نہیں پچھتاؤ نہیں، چلتا ہی رہے گا دور یونہی
مٹتے ہی رہیں گے نقش یونہی بدلا ہی کریں گے طور یونہی(۱۳)

جس وقت قلات نیشنل پارٹی پر پورے ملک میں پابندی لگائی گئی تو اس سے میر گل خان نصیرؔ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی سیاسی سر گرمیاں محدود ہو کر رہ گئیں۔(۱۴) دوستوں کو پابند سلاسل کیا گیا۔ ایسے موقع پر پارٹی کارکنوں اور قومی اصلاح کے لیے کام کرنے والے افراد کے حوصلے پست ہونے لگے۔ لیکن میر گل خان نصیرؔ نے فوراً وقت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے اپنے قلم اور اپنی شاعری کے ذریعے سے دوستوں کی ہمت بڑھانے لگے۔ انھوں نے مشکل وقت میں کارکنوں کو یقین دلایا کہ راستہ کٹھن بجا لیکن اس راستے پر ڈٹے رہنے والے ہی کامیابی پا سکتے ہیں۔ حالات گو ان کے حق میں نہیں ہے لیکن مصائب سے ڈر کر عَلم کو جھکانا مردوں کا شیوہ نہیں۔ آزمائش کی سختی ارادوں کو مضمحل نہیں کر سکتی اور موت سے لڑنے والے ہی ان آزمائشوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان میں سر خرو ہو سکتے ہیں۔ میر گل خان نصیرؔ نے جس طرح سے مشکل وقت میں قومی تحریک کی حفاظت کے لیے قوم اور کارکنوں کو بیدار رکھا وہ قابل ستائش ہے۔ ان کی نظم ''جھک نہ جائے یہ عَلم'' سے اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ کٹھن ہے راستہ
جس پہ ہم رواں ہیں
کوندتی ہیں بجلیاں
دشمن آسمان ہیں
گونجتے ہیں زلزلے
مٹ رہے نشان ہیں
ٹوٹتے ہیں حوصلے
سخت امتحان ہیں
اس پہ وہ جواں بڑھے

موت سے جو لڑے(۱۵)

میر گل خان نصیرؔ اپنے دوستوں کو ان کٹھن حالات میں پرچم حق بلند کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ حاکم وقت کو یہ یقین ہے کہ وہ پابندیوں سے قوم کے غمخواروں کی آواز دبالے گا لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتے میر گل خان نصیرؔ جیسا شاعر دوستوں کو ظلِ سبحانی کی تخت کو الٹنے کا درس دے رہے تھے۔ مسند پر بیٹھے آقاؤں کو اب خاک پر لے آنے کے لیے قوم کا یہ شاعر قوم کے دلوں میں ایک ایسا طوفان اٹھا رہا تھا کہ جس کے آگے امیرانِ وطن کے محل خس و خاشاک ثابت ہونے والے تھے۔ بیداری قوم اور میدان عمل کی طرف بڑھنے کی دعوت کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

ساتھیو عزمِ جواں لے کے اُٹھو
سرخ پرچم کا نشاں لے کے اُٹھو
یہ جو ہیں اپنے امیرانِ وطن
ظلِ سبحان و کبیرانِ وطن
یہ غلط کار مشیرانِ وطن
ان کو مسند سے اٹھانے کے لیے
ساتھیوں عزمِ جواں لے اُٹھو(۱۶)

میر گل خان نصیرؔ پوری زندگی قوم کی اصلاح اور تربیت کرتے رہیں۔ وہ قوم کو ان کی عظمت رفتہ یاد دلاتے رہیں۔ انھیں ماضی کے قصے سنا سنا کر مستقبل کے لیے تیار کرتے رہیں۔ وہ آخری وقت تک قوم سے بیدار ہونے کی التجاء کرتے رہیں۔ ان کی خواہش ایک ایسی خواہش تھی کہ جس کی تکمیل ہر بلوچ پر فرض ہے۔ وہ بلوچ قوم کو ایک بار پھر شانِ مسیحائی کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ بلوچوں کی ہیبت سے دنیا کے ظالموں کو کانپتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے اور چار دانگ عالم میں بلوچوں کی زبان سے نکلی نعرہ تکبیر کی گونج سننا چاہتے تھے۔ بلوچی زندگی جو ایک شاندار اور بھرپور زندگی ہوتی ہے اس کی ایک جھلک میر گل خان نصیرؔ دنیا کو دکھانا چاہتے تھے جس کے لیے وہ بار بار قوم کو جگاتے رہیں۔ وہ دنیا کو بتانا چاہتے تھے کہ صحرا نشینوں کے طرز زندگی کیا ہے اور ان کی

طاقت کتنی ہے ؟اگر یہ صحرا نشین قوم کرنے پہ آجائے تو کیسے دنیا کے نقشے بدل سکتی ہے۔اقوام عالم کی صفوں میں بلوچوں کا مقام حاصل کرنا ہی میر گل خان نصیرؔ کا مقصد حیات کا حصہ تھا۔ان کے تین اشعار ملاحظہ ہوں جو بلوچ قوم کے نام ہیں:

اُٹھ اے قوم بلوچی اٹھ بہ اندازِ دل آرائی
دکھا دے آج پھر دنیا کو وہ شانِ مسیحائی
اٹھو اور نعرہ تکبیر سے دنیا کو تھرا دو
دکھا دو قوتِ بازو کی پھر عالم کو گیرائی
بلوچی زندگی کی شان پھر دنیا کو دکھلادے
بتادے ان کو کر سکتی ہے کیا یہ قوم صحرائی(۱۷)

گل خان نصیرؔ کی شاعری میں ایک اہم سبق جو قوم کے لیے ہے وہ محنت اور خود داری کا۔وہ قوم کو یقین دلانے کی کوشش کرتے رہیں کہ دنیا میں اگر کوئی بڑی طاقت ہے تو وہ محنت، مخلصی اور خودداری کی ہے۔ اگر عزم کامل ہوں تو طوفانوں کا رخ موڑنا مشکل نہیں ہے۔پتھروں کا پگھلنا ناممکن بات نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے لیے جذبے صادق ہونے چاہیے۔وہ اپنی قوم کو کاہلی اور تن آسانی سے نکلنے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کے ہاں حرکت و عمل کا یہ پیغام انتہائی معنی خیز ہے۔اگر اس سبق پر عمل کیا جائے تو زندگی کی کوئی بھی مشکل انسان کا حوصلہ پست نہیں کر سکتی اور نہ ہی کبھی انسان ہمت ہارے گا:

کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا نصیرؔ
کام کرنے کو جواں مردی و ایماں چاہیے(۱۸)

میر گل خان نصیرؔ کی شاعری فکر، شعور اور عقل کا خزانہ ہے۔نوجوان طبقے کا میر گل خان نصیرؔ کی شاعری میں ایک خاص مقام ہے۔انھیں نوجوانون سے خاص محبت تھی۔میر گل خان نصیرؔ نوجوانوں سے ہمکلام ہونے میں ایک خاص لذت محسوس کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں قوم کے نوجوان طبقے کو خاص اہمیت دی اور ان سے ہم کلام بھی ہوئے۔نوجوانوں کا حوالہ میر گل خان نصیرؔ کو علامہ اقبال کے رنگ کے قریب

کرتا ہے۔ میر گل خان نصیرؔ جو کہ خود بھی علامہ اقبال سے متاثر رہے ہیں وہ اقبال کے شاہین کی طرح بلوچ نوجوانوں کی ذہنی تربیت کا بھیڑا اٹھائے نظر آتے ہیں۔ اقبال کی شاعری اور فکر میں نوجوانوں کو جو مقام اور اہمیت دی گئی ہے، بلکل اسی طرح کی امیدیں میر گل خان نصیرؔ نے بھی نوجوانوں سے وابستہ رکھی ہیں۔

نوجوان طبقہ کسی بھی قوم کا اثاثہ ہوتا ہے۔ قوم کی ترقی اور عروج وزوال میں نوجوانوں کا کردار بہت خاص ہوتا ہے۔ قوم کا وہ طبقہ جو طویل عمر گزار چکے ہوں وہ قومی مسائل کے حل کے لیے اس قدر جلدی متحرک نہیں ہو سکتے جس قدر جلدی نوجوان تیار ہوتے ہیں، اس لیے نوجوان ہی کی بنیاد پر قوموں کے عروج اور زوال کے اقدامات سامنے آتے ہیں۔ جس قوم کے نوجوانوں کا نظریہ درست ہو اور سمت کا تعین بھی ٹھیک ہو، ان کی تربیت میں کمی نہ ہو تو پھر اس قوم کی ترقی ایک لازمی امر ہے۔ لیکن اگر اس طبقے کی تعلیم و تربیت نہ ہو، کوئی نظریہ نہ ہو اور یہ لایانی کاموں میں وقت ضائع کریں جن کا نہ دنیا میں فائدہ ہو اور نہ ہی آخرت میں تو پھر قوم ترقی کی بجائے تنزلی کی سفر پر رواں ہو گی۔ اسلامی تاریخ کی رو سے دیکھا جائے تو نوجوانوں کی اہمیت مزید کھل کر سامنے آتی ہے۔ انبیاء کرام ہمیشہ تحریکات کی بنیاد نوجوانوں پر ہی رکھتے رہے ہیں۔

جنگ عظیم اول سے پہلے ہر طرف ظلم واستبداد کا گھٹاٹوپ اندھیرا تھا۔ انسانیت کی قدرے مختلف شکلوں میں پامال ہو رہی تھیں۔ برصغیر پر غلامی کا داغ مزید گہرا ہو گیا تھا۔ لیکن جنگ عظیم اول کے بعد وقت نے رفتار بدل لی اور حالات کے بہاؤ نے ایک نیا رُخ اختیار کیا۔ سامراجی بالادستی کے دن گنے گئے اور پہلی جنگ عظیم کے دوران ہی ۱۹۱۷ء میں ہی اُمید کی ایک کرن پوری دنیا کے مظلوموں کے لیے پیدا ہوئی جس کی روشنی میں انسان دوستی بھائی چارہ اور برابری جیسی صفات کی تلاش شروع کی گئی۔ برصغیر کے غلام قوموں کے دلوں میں آزادی کی ایک چنگاری پیدا ہوئی اور دہکتے ہوئے انگاروں اور پھر غلام قوموں کے باشندوں کے سینوں میں بھڑکنے والی آگ کی شکل اختیار کرنے لگی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں نے دیکھا کہ محکوم اقوام کے ہاں آزادی کے ولولے اُبلنے لگے اور زبردست تحریکیں بھی شروع ہوئیں۔ جب پوری دنیا کے محکوموں نے آزادی کے نعرے بلند کیے تو یہ نعرے برصغیر میں بھی گونجنے لگے۔ بلوچ نوجوانوں نے نہ صرف ان نعروں کو سنا بلکہ ان

نعروں کے جواب بھی دیئے۔ان نوجوانوں میں خاص طور پر نواب یوسف عزیز مگسی اور میر عبدالعزیز کرد کے نام سر فہرست لیے جاسکتے ہیں۔اسی طرح سے میر گل خان نصیرؔ جو کہ پہلے سے ہی وطن کی محبت سے سرشار تھے انھوں نے ان تحریکوں سے رشتہ جوڑا۔

لاہور کی سیاسی فضاء نے جب میر گل خان نصیرؔ پر اپنے اثرات مرتب کیے تو وہ پہلے سے زیادہ سیاسی شعور کے مالک بن گئے۔(۱۹) جس وقت وہ بلوچستان لوٹے تو بلوچستان کے حالات عام آدمی کے لیے انتہائی بدتر تھے۔انھوں نے میر عبدالعزیز کرد اور نواب یوسف عزیز مگسی کے ساتھ مل کر ان کی سیاسی تحریک کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ برطانوی حکومت اور اس کے حواری جن میں سر شمس شاہ جیسے لوگ شامل تھے انھوں نے ان نوجوانوں کی سیاسی جرات اور شعور کو دیکھ کر اپنے سیاسی مستقبل کی فکر کرنے لگے اور وہی راستہ اپنایا جو ہمیشہ سے حق کو دبانے کے لیے باطل کے پیروکاروں نے اپنایا ہیں۔ حکومت برطانیہ اور سر شمس نے عبدالعزیز کرد اور ان کے چند دیگر ساتھیوں کو جیل میں ڈال دیا تاکہ ان جوانوں کے دل میں موجود جذبہ آزادی دھیما پڑ جائے لیکن:

زندان میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی

ان جوانوں کے جیل جانے سے باقی نوجوان ساتھیوں کے حوصلے پست ہونے کے بجائے مزید بلند ہو گئے اور گل خان نصیرؔ جیسے شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک حساس جوانوں نے دوستوں نے سامراج کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کیا اور قلم کی طاقت سے ان کو جواب دینے لگے۔ ۳۵ فروری ۱۹۳۴ء کو ایک مکمل نظم میں انگریز سامراج کو ان کے اس غیر سیاسی اور غیر آئینی اقدام پر للکارنے لگے:

آ گیا وقتِ امتحانِ بلوچ
اب ہے کچھ اور آسمانِ بلوچ
قید سے کیوں اُنھیں ڈراتے ہو
طفلِ ناداں نہیں جوانِ بلوچ(۲۰)

فرنگی کی اس حرکت پر نہ صرف میر گل خان نصیرؔ نے نہ صرف اسے جواب دیا بلکہ اپنے جوانوں کی ہمت بھی بڑھائی اور اپنے اشعار کے ذریعے ان کے دل میں ایک ایسا جذبہ پیدا کیا کہ ان کے نوجوان ساتھی قید

وبند کی صعوبتوں کو خاطر میں بھی نہیں لانے لگے۔ان نے بلوچوں کی عظمت کے گن گا کر جوانوں کو بتایا کہ بلوچ کبھی سلاخوں سے کمزور پڑھنے والے نہیں ہیں اور نہ ہی ایسی حرکتیں انھیں ان کے مقصد سے خائف کر سکتے ہیں۔اسی نظم میں میر گل خان نصیرؔ آگے لکھتے ہیں:

خوفِ زندان نہیں بلوچوں کو
جان پر کھیلنا ہے شانِ بلوچ
ملک و ملت کے واسطے قربان
مال و دولت، عزیز و جانِ بلوچ(۲۱)

میر گل خان نصیرؔ کے دور میں ان کی قوم کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ یہ طبقہ اس وقت لایعنی کاموں میں مشغول تھا۔ معاشرے میں ہر طرف حالات کروٹ لے رہے تھے،دشمن کی عیاریاں عروج پر تھیں، ظلم و ستم کا دور دورہ تھا،آزادی کی تحریکیں زوروں پر تھیں اور قوم کو اپنے نوجوانوں کی سخت ضرورت پیش آرہی تھی۔ لیکن نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد شب ورز کی گردش کو خاطر میں لائے بغیر اپنے بے عملی کی روش پر قائم تھی اور انھیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھا کہ ہر گزرتا لمحہ ان کے آنے والے کل کا فیصلہ کرتا چلا جارہا ہے۔ایسے موقع پر میر گل خان نصیرؔ قوم کے نوجوانوں کو احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اب مزید بے حسی اور لاپروائی کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ وہ نوجوانوں سے توقعات رکھتے ہیں کہ یہی وہ سپوت ہونگے جو قوم کی ڈوبتی کشتی کو پار لگائیں گے اور حالات کے منجھدار سے نکالنے کی کوشش کرینگے۔ لہٰذا وہ نوجوانوں سے مخاطب ہوتے ہیں اور انھیں میدان عمل میں کچھ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ نوجوانوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر کچھ کر گزرو مبادا وہ وقت آجائے کہ تمھارا نام مٹ جائے اور تمھاری داستان تک داستانوں میں نہ مل سکے۔ وہ نوجوانوں کو آباء کی یاد میں نوحہ کناں ہو کر بیٹھ جانے سے روکتا ہے کہ آخر کب تک اس یاد رفتگاں میں گم رہ کر وہ وقت کو برباد کرتے رہیں گے۔ وہ اقبال کی طرح اپنے نوجوانوں کو زور بازو پر بھروسا رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔۲۶ جون ۱۹۳۷ء کی اپنی ایک تخلیق میں لکھتے ہیں:

اٹھو اے نوجوانوں اب عمل کا وقت آیا
یہ طفلانہ تسلی اور یہ آہ و فغاں کب تک
بھروسا تم کو کرنا چاہیے اب زورِ بازو پر
یہ لاحاصل حکایات اور یادِ رفتگاں کب تک(۲۲)

ناامیدی کفر ہے اور امید سے ہی زندگی عبارت ہے۔ میر گل خان نصیرؔ محنت اور مسلسل کاوش پر یقین رکھتے تھے۔ انھیں سوکھے پتوں کی طرح خزاں کے بے رحم ہواؤں کے ہاتھوں اڑنا منظور نہیں تھا۔ وہ تقدیر کو کبھی دوش نہیں دیتے تھے بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ قوم کی حالت کے ذمہ دار خود قوم اور خاص کر نوجوان طبقہ ہے جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں۔ وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے قائل تھے۔ وہ مردان اولعزم کی طرح زور بازو سے طوفانوں کا رخ موڑنا چاہتے تھے۔ لیکن انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ ایک ایسے وقت میں جب وطن کی فضائیں بارود کی بو سے آلودہ ہیں، حاکموں کے طرف سے دیے گئے زخم مظلوموں کے جسموں پر ناسور بنتے جارہے ہیں وطن کے بہاروں کو خزاں نے یرغمال بنایا ہوا ہیں اور شہر بھر کی گلیوں سے صدائے موت آتی ہے، ایسے وقت میں بھی قوم کے نوجوان مقدر کو مورد الزام ٹھہرا کر اشک بہانے میں مصروف ہیں۔ ان کو اہل وطن کی تباہی سے غرض ہے اور نہ ان کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت کا دکھ ہے جو کبھی ان کے باپ دادا کی شان تھی۔ ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی ان کی ایک نظم ''میرے دیس کے نوجواں سو رہے ہیں'' سے ایک بند اس طرح ہیں:

''گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے''
فضا پے بہ پے آگ برسا رہی ہے
جہنم کی صورت نظر آ رہی ہے
غلامی ستم پر ستم ڈھا رہی ہے
گلستان نذرِ خزاں ہو رہے ہیں
میرے دیس کے نوجواں سو رہے ہیں(۲۳)

میر گل خان نصیرؔ نوجوانوں کے سامنے وطن کی حالت زار کی ایسی منظر کشی کرتے ہیں کہ جس کو دیکھ کر نوجوانوں کا لہو کھولنے لگتا ہے۔ وہ نوجوانوں کو ان کی جوانی کا طعنہ دیتا ہے کہ یہ کیسی جوانی ہے جس میں کوئی

جوش نہیں ہے۔ سیلابی شور رکھنے والے بلوچ نوجوان آج خاموش بت بنے بیٹھے ہیں۔ طوفانی زور رکھنے والے نوجوانوں کے ہاتھوں میں آج طاقت مفقود ہیں، اور تو اور ان کے دل میں احساسِ سود و زیاں بھی نہیں ہے۔ ''میرے دیس کے نوجوان سو رہے ہیں'' کے اشعار میں نوجوانوں کی حالت اس طرح سے ہیں:

کسی کو نہ احساس سود و زیاں ہے
نہ ہاتھوں میں طاقت نہ منہ میں زباں ہے
جوانی میں پیری کی صورت عیاں ہے
کہ باغِ وطن میں خزاں ہی خزاں ہے
مکینوں سے خالی مکاں ہو رہے ہیں
میرے دیس کے نوجواں سو رہے ہیں (۲۴)

نوجوان کسی بھی معاشرے میں مثالی کردار ادا کرتے ہیں۔ میر گل خان نصیرؔ اس حقیقت سے آشنا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک قوم کے جوان اس خواب غفلت میں سوتے رہیں گے تب تک ترقی کا سفر طے کرنا خواب مجنوں کے مترادف ہوگا۔ جب بھی وہ گرد و پیش میں نگاہ کرتے ہیں اور سیاسی بساط پر جاری چالبازیوں، سماج کے اندر موجود شعور اور آزادی کے نغموں سے گونجتے فضاؤں کو دیکھتے ہیں اس لمحے وہ بے تاب ہو کر دیوانہ وار اپنے نوجوانوں کو پکارتے ہیں جن کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ سارے بلوچ نوجوان جو میرا فکر پڑھتے ہیں وہ میرے بیٹے ہیں۔ (۲۵) وہ اپنے ان بیٹوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے پکارتے ہیں اور انھیں حوصلہ دے کر حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

میر گل خان نصیرؔ جب دشمن کو مزید حاوی ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تب اس کی بے چینی اور اضطراب میں مزید اضافہ ہوتا ہے تب وہ ان جوانوں کو واسطہ دینے لگتے ہیں، وہ نوجوانوں کو ان کی عظمت رفتہ اور آباء و اجداد کی خاطر اٹھنے کو کہتے ہیں۔ میر گل خان نصیرؔ کو بلوچستان کی تاریخ سے محبت تھی وہ جب بھی دیکھتے تھے کہ تاریخ کے اوراق میں موجود اسلاف کے کارنامے اب وقت کی رفتار کی گرد میں گم ہوتے جارہے ہیں تو وہ ایسے

موقع پر پھر سے نوجوانوں کی طرف دیکھ کر اس کو بچانے کی التجاء کرتے ہیں۔ وہ نوجوانوں کو اوج ثریا کی طرف سفر کرنے کی دعوت دیتے ہیں:

اٹھو باپ دادوں کی عزت کی خاطر
اٹھو قوم و ملت کی عظمت کی خاطر
اٹھو خاکِ پستی سے رفعت کی خاطر
اٹھو قوم کے نوجوانو اٹھو تم
اٹھو دیس کے پاسبانوں اٹھو تم(۲۶)

جب تمام تر طعنے اور واسطے ختم ہو جاتے ہیں تب میر گل خان نصیرؔ وہ آخری بات کرتے ہیں جس کو سننے کے بعد شاید ہی کوئی بلوچ جوان مزید بے حسی میں میں وقت گزارے۔ وہ بات جو کسی بھی بلوچ نوجوان کے کانوں میں پڑنے کے بعد اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی وہ 'غیرت' کی بات ہے۔ وہ بلوچ نوجوانوں کو ان کی غیر ت یاد دلا کر جب اٹھنے کی تلقین کرتے ہیں تو اسے یقین ہوتا ہے کہ اب یہ نوجوان اپنے وطن کے لیے ہر طرح کی قربانی سے دریغ نہیں کرینگے۔ میر گل خان نصیرؔ جس طریقے سے غیرت دلاتے ہیں وہ بھی انوکھا انداز ہے۔ وہ اپنی بے بسی اور کمزوری کو ظاہر کر کے اپنی بات میں درد پیدا کرتے ہیں اور سننے والے جب سنتے ہیں کہ جب ان کا ہی کوئی بزرگ اس قدر حالات سے عاجز آچکا ہے اور انھیں بلا رہا ہیں تو وہ اس آواز پر پوری توجہ کے ساتھ کان دھرتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔ میر گل خان نصیرؔ کے غیرت دلانے کا انداز ملاحظہ ہو:

تمھیں غم کا دکھڑا سناؤں کہاں تک
اشکوں کے موتی لٹاؤں کہاں تک
کسی کو میں غیرت دلاؤں کہاں تک
میں خونابۂ دل بہاؤں کہاں تک(۲۷)

میر گل خان نصیر صرف نوجوانوں کو عمل کی دعوت نہیں دیتے بلکہ وہ انھیں ان کا کام بھی بتا کر ایک حقیقی لیڈر اور رہبر کا فریضہ بھی سمجھاتے ہیں۔ وہ نوجوانوں کو بتاتے ہیں کہ اب ان کے ذمے ہے کہ وہ اٹھ کر اپنی تقدیر کو بدل دے۔ جہاں میں ایک اپنا ایک مقام پیدا کرے۔ جس نظام نے انھیں غلام بنا کر رکھا اس نظام کو

بنیادوں سے اکھاڑ کر ختم کریں، زمانے کو بتادیا جائے کہ ان کی بھی کوئی پہچان ہے۔ان کے ہونے کا احساس جہاں کو ہوں کہ بلوچ نوجوان اور بلوچ قوم ایک حقیقت ہے اور ایک ایسی طاقت ہے کہ جو زمین کا جغرافیہ تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔لکھتے ہیں:

اٹھو اٹھ کے دورِ جہاں کو بدل دو
زمیں کو ہلا دو زماں کو بدل دو
اٹھو اٹھ کے کون و مکاں کو بد ل دو (۲۸)

میر گل خان نصیرؔ کی ایک اور نظم ''اُٹھ اے بلوچ نوجوان'' کے نام سے ہے۔اس نظم میں حرکت و عمل کی زبردست دعوت ہے۔ نوجوانوں کے نام اس تخلیق کے اندر ایک مکمل منشور نوجوانوں کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ میر گل خان نصیرؔ اپنے جوانوں کو ہمت دلا کر وترقی کی طرف سفر کرنے والے اقوام کے قافلے میں شامل ہونے کی ہدایت کرتے ہیں۔ وہ ایک بزرگ ناصح کی طرح سے نصیحت کرتے ہیں لیکن اس بزرگ کے لہجے میں اس قدر ہے کہ جوانوں سے زیادہ جوان معلوم ہوتا ہے۔ عصر حاضر کی نبض پر ہاتھ رکھنے والے میر گل خان لکھتے ہیں:

سپیدہ دم ہوا عیاں
بڑھا چلا وہ کارواں
یہ کہہ رہا ہے سارباں
نہیں یہ خواب کا سماں
تو کارواں کے ساتھ چل (۲۹)

اس نظم کے نیچے ۱۰ مئی ۱۹۴۴ء کی تاریخ درج ہے۔اس تاریخ کی مناسبت سے دیکھا جائے تو یہ وہ دور ہے کہ جب جنگ عظیم دوم کی تباہ کاریوں کے بعد برطانوی حکومت برصغیر میں کمزور ہو چکی تھی، برصغیر کے اندر آزادی کی تحریکیں عروج پر تھیں، ایک آزاد اور روشن صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے، صبح آزادی کی سپیدہ اب دکھنے لگی تھی۔ایسے موقع پر میر گل خان نصیرؔ جانتے تھے کہ اب وقت آگیا ہے کہ وطن کے اندر موجود لات

و منات کو نکال پھینکا جائے اور اور بتان سو منات کو پاش پاش کیا جائے۔ وہ اس نازک موقع پر نوجوانوں کو بلاتے ہیں، سمجھاتے ہیں اور ان کندھوں پر تھپکی دے کر ان کی کامیابی کے لیے دعا کرتے ہیں:

بتانِ سومنات کو
یہ پیکران ذات کو
یہ مغربی نبات کو
شہاب ذات پات کو
وطن سے یوں نکال دے
تجھے نہ پھر وبال دے
نہ رنج دے ملال دے
کہ ہر بشر یہ حال دے
بلوچ تیز گام ہے(۳۰)

وطن سے محبت ایک فطری عمل ہے۔ کسی شخص کا اپنے وطن سے اپنی زمین سے محبت کرنا حب الوطنی ہے۔ حب الوطنی کا تقاضا ہے کہ محب شخص اپنے وطن سے اپنی قوم سے ذہنی اور ثقافتی طور پر جڑا ہوا ہو۔ جب حب الوطنی کا جذبہ دل و دماغ میں بیدار ہو گا تو پھر محب وطن شخص قوم و ملک کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا اور اس کی بقاء کے لیے ہمہ وقت تیار رہے گا۔

میر گل خان نصیر کی شاعری کا ایک سب سے اہم اور بڑا حوالہ ان کی حب الوطنی ہے۔ جب میر گل خان نصیر کی شاعری کو وطن سے محبت کے عنوان کے تحت زیر مطالعہ لائی جائے تو یہاں وہ ایسے شاعر کے روپ میں نظر آتے ہیں جو عالم رنگ و بو کی دیگر رنگینیوں سے بے پرواہو کر اپنی محبوب سرزمین پر نگاہیں جمائیں عالم بے خودی میں اس کی ثناء میں اشعار کے قالب میں الفاظ کے موتی جڑتا ہے۔ ان کی حب الوطنی کے بارے میں شاہ محمد مری لکھتے ہیں:

''میر گل خان کی شاعری کا دوسرا نام بلوچستان ہے۔ بلوچ، بلوچستان اور گل خان۔ ایک بڑی مقدس مثلث ہے۔ اور ایک پوری زندگی، ایک عہد اس تکون سے جانا جانے لگا۔''(۳۱)

میر گل خان نصیرؔ بلوچستان کی سرزمین اور بلوچ قوم سے حد درجہ تک محبت کرتے تھے۔ان کی حب الوطنی نے ان کی شاعری میں ایک ایسا رنگ بھرا جو باقی تمام رنگوں کے مقابلے میں نمایاں ہے۔ان کی وطن سے محبت کی کئی وجوہات ہیں۔ان میں سے ایک وجہ تو فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے۔اس کے علاوہ خاندانی پس منظر نے بھی میر گل خان نصیرؔ کے دل میں وطن کی محبت کو بیدار کیا۔گل خان نصیرؔ ایک ایسے خاندان کے چشم وچراغ تھے جن کے افراد کو تاریخ میں وطن دوست اور قوم دوست لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی خاندان نے نصیر خان (دوئم) کی، اُن کے والد کی وفات کے بعد مدد کی۔میر گل خان نصیرؔ کے بزرگوں نے ملک وملت کے لیے ہمیشہ قربانیاں دی اور بیرونی حملہ آوروں کے سامنے ڈٹے رہیں۔اس کے بدلے میں ان کے خاندان کو بہت سی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کے بزرگ کسی بھی اذیت، سازش اور تکلیف سے گھبرانے والے نہیں تھے۔ان بزرگوں کی صحبت اور تربیت نے ایک ایسے نوجوان کو تیار کیا جس نے آگے چل کر عشق وطن میں ایسی تاریخ رقم کی کہ قوم آج بھی اس کا ممنون ہیں۔

میر گل خان نصیرؔ کی شاعری میں حب الوطنی کا رنگ گہرا ہونے کی ایک اور اہم وجہ اس وقت کے سماجی وسیاسی حالات تھے۔جب وہ سن شعور میں داخل ہوئے تو انھوں نے ہر طرف بدحالی اور غربت کو دیکھا۔ انھوں نے افلاس کے گہرے بادل ندیکھے۔اپنے لوگوں کو ایک وقت کی روٹی کے لیے تڑپتے دیکھا۔چاند جیسے چہروں والی حسیناؤں کے چہرے بھوک کی وجہ سے پہچانے نہیں جارہے تھے، خوبرو بلوچ نوجوان ایک ایک نوالے کے پیچھے تڑپ رہے تھے، سونے سے بھری زمینوں کے مالک ننگے پاؤں چلنے پر مجبور تھے، دوسری طرف سردار اور فرنگی آقاؤں کی عیاشیاں اور سرمستیاں عروج پر تھیں۔غلامی کا طوق ان کے گلے میں بھی بچپن سے ڈالا گیا تھا۔وہ اپنی قوم کی بدحالی اور اور سرزمین کی غلامی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ان کا کہنا تھا:

> ''جب کہ اپنے مادر وطن اور اپنی قوم سے مجھے دلی وابستگی ہے اور میرا وطن میرا محبوب ہے۔تب وہ کون ایسا بدنصیب عاشق ہوگا کہ اپنی محبوبہ کو تباہ حال و خانماں برباد ہوتا

دیکھے۔اور اس کے تن بدن میں آگ نہ لگے۔دل میں درد کی ٹھیس نہ اٹھیں اور آنکھوں
سے سیلاب اشک رواں نہ ہوا۔''(۳۲)

حالات نے میر گل خان نصیرؔ کے دل میں وطن کی محبت اور قوم سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا جو آگے چل کر بہت ہی واضح انداز میں ان کی شاعری کا حصہ بن گیا۔اسی کے علاوہ میر گل خان نصیرؔ مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال سے بھی متاثر تھے اور ان دونوں شعرا کے رنگ میں شاعری کرتے تھے۔ان شعراء کے ہاں حب الوطنی کا جذبہ میر گل خان نصیرؔ کے لیے تحریک کا باعث بنا۔انھوں نے ان شعرا کی طرح عشق وطن کو رقم کرنا شروع کیا۔میر گل خان نصیرؔ کی محبوبہ بلوچستان کی سرزمین کو قرار دے تو بے جانہ ہوگا۔بقول ان کے:

''۔۔۔۔۔میرے اکثر دوستوں کو جو محفل آرائیوں کے دلدادہ ہیں، مجھ سے گلہ رہا ہے کہ
میں ان کے مزاج کے مطابق شعر نہیں کہتا بلکہ شعر و سخن کی فیکٹری میں آلات جنگ
گھڑتا ہوں۔میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شاعری عشق کے بغیر ممکن نہیں اور مجھے اپنی قوم و
وطن سے عشق ہے۔''(۳۳)

انھوں نے جس شدت کے ساتھ بلوچستان سے محبت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔محبت کا عالم یہ ہے کہ ادھر کوئی منظر آنکھوں کے سامنے گزرا ادھر میر گل خان نصیرؔ کے قلم نے موتی پرونے شروع کیے۔وہ اپنی ایک نظم 'میرا دیس پیارا' جو انھوں نے ۱۹۴۹ء۔۲۔۱۴ کو نوشکی میں تخلیق کی میں وطن سے محبت کا اظہار قدرے مبالغے کے ساتھ کرتے ہیں۔میر گل خان نصیرؔ کا دل نوشکی کے سنہرے صحراؤں میں دھڑکتا ہے۔ان کا رشتہ اپنی زمین سے ہے اور ان کی جڑیں بلوچستان کی زمین میں گہرائی تک پیوست ہے۔وطن کی محبت ان کی رگ وپے میں رچی بسی ہے۔بقول ان کے ان کے علاقے میں ریت کا رنگین اور قابل رشک فرش بچھا ہوا ہے۔سورج کی کرنیں اپنی حسن کو بڑھانے کے لیے ان کے علاقے کی ریت کے ذروں سے قوس قزاح بنانے میں مگن ہیں۔مہر تاباں بے تاب ہے کہ وہ اس صحرا میں اپنی شعاعیں بھیج کر اس کے ذروں کی چمک سے لطف اندوز ہوں:

یہ صحرا، یہ بد مست جھونکوں کا طوفاں
یہ ریتوں کا فرشِ درخشندہ رنگیں

جہاں مہر تاباں کی ضو باد کرنیں
فضاؤں میں قوس و قزاح کھینچتی ہیں
یہ زریں شرارا
میرا دیس پیارا(۳۴)

میر گل خان نصیرؔ بے آب و گیاہ چٹیل میدانوں کے متوالے ہیں۔ وسائل سے بھرپور اس سرزمین کی خاک کو میر گل خان نصیرؔ آنکھوں کا سرمہ سمجھتے ہیں۔ اس کی زمین میں یہ خطہ زمین دنیا کا سب سے حسین کنارہ ہے۔ بلوچستان کے ساحلوں پر جو پانی موجوں کی صورت میں زمین سے ٹکرا رہا ہے وہ دراصل سمندر کی بیتابی ہے جو دیوانہ وار میر گل خان نصیرؔ کی سرزمین کو چومنے بڑھتا ہے۔ یہ بلند و بالا پہاڑ جو سورج کی تمازت سے نیلے پڑھ گئے ہیں یہ گل خان نصیرؔ کی نظر میں اس کی زمین کے قلعے ہیں جنھیں فضائیں بوسہ دیتی ہیں۔ (علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ہمالہ'' میں کوہ ہمالیہ کو ہندوستان کی زمین کے لیے فصیل کہا تھا۔ یہاں میر گل خان نصیرؔ کے کلام پر اقبال کا رنگ نظر آتا ہے) وہ بلند و بالا پہاڑوں کو دیکھ کر مسرت حاصل کرتے ہیں۔ کوہِ ماران اور چلتن کی چوٹی پر گرنے والی برف دراصل دستار فضیلت ہے جو ازل سے رب کائنات نے اس کے حصے میں لکھی ہے۔ ان کے دیس کی عظمت کو خدا نے خود بلندی عطا کی ہے اور کوئی اس عظمت اور رفعت کو اس سے چھین نہیں سکتا:

یہ اسپید عمامہء برف خلعت
جو ہے کوہِ ماران و چلتن کے سر پر
فضیلت کی پگڑی ملی ہے ازل سے
میرے دیس کی پُرشکوہ رفعتوں کو
یہ عظمت کا تارا
میرا دیس پیارا(۳۵)

داغستان کے مشہور شاعر رسول حمزہ توف نے کہا تھا کہ:

''میرے گاؤں، میرے پہاڑوں، میرے داغستان! تم میرے خیالات، میرے احساسات کا آشیانہ، میری آرزوؤں کا کاشانہ ہو۔ داغستان میرا چولہا ہے، میرا جھولا ہے۔''(۳۶)

میر گل خان نصیرؔ بلوچستان کا رسول حمزہ توف ہے۔ جس طرح سے روس کے رسول حمزہ توف کو اپنی دھرتی سے محبت تھی اور وہ دن رات اس کے گن گاتے تھے اسی طرح سے میر گل خان نصیرؔ کو بھی عشق وطن رات کو کروٹیں بدلنے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ وطن کے رخ زیبا پر اغیار کے لگائے ہوئے زخموں کو دیکھ سکتا ہیں، وہ جانتے ہیں کہ آج وطن کا چہرا اترا ہوا ہے، بام و در میں اندھیرا چھایا ہوا ہے، اس کی محبوبہ (سرزمین) کی کانوں کی بالیاں چھین لی گئی ہیں، اس کے چہرے پر فرنگی شریروں کے طمانچے ہیں، آنکھوں میں آنسو کی جگہ اب لہو امڈ آیا ہے، دھرتی کے فرزندوں کا خون پانی کی طرح بہایا جارہا ہے، لیکن ان سب کے باوجود اس کے عشق میں کمی نہیں آئی ہے، اس ظلم و ستم نے ان کے دل میں موجود آبائی زمین کی محبت اور اس کے باسیوں کی چاہت کم نہیں ہوئی ہے۔ وہ ۲۵ مئی ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی اپنی ایک نظم میں سرزمین وطن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

تیری مٹی میں ملا ہے میرے اجداد کا خون
نوجوانوں کا لہو طالع برباد کا خون
نرگسی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے رنگین آنسو
اور ناکام محبت دل ناشاد کا خون
تب میرے پیارے وطن تجھ کو میں چھوڑوں کیسے
خون اور خاک کے رشتے کو میں توڑوں کیسے(۳۷)

جن لوگوں کے درمیان میر گل خان نصیرؔ نے زندگی کے شب و روز گزارے تھے ان کی محبت میر گل خان نصیرؔ کے دل میں ہمیشہ رہی۔ ان لوگوں کے عشق میں ہی میر گل خان نصیرؔ نے پُر اثر اور پُر تاثیر الفاظ سے مزین اپنا کلام لکھتے رہے۔ وطن کے باسیوں کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ ہمیشہ سے ان کے دل میں تھا۔ وہ خاص طور پر اپنے وطن کے لوگوں کی حالت کو بدلنا چاہتے تھے اور انھیں سرداروں کے ظالمانہ نظام سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے وطن کے ماتھے پر سرداری نظام کا جو داغ لگا تھا اسے وہ دھو لے۔ وطن کی مٹی اور باسیوں کو کسی حال میں وہ تنہا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ وہ ہر غم میں برابر کے شریک بننا چاہتے تھے اور ان کی خواہش اپنی وطن کی مٹی میں فنا ہونے کی تھی:

میں نہ چھوڑوں گا تجھے ظلم و ستم سے ڈر کر
میں نہ چھوڑوں گا تجھے رنج و الم سے ڈر کر
میں نہ چھوڑوں گا تجھے ہاتھوں میں سرداروں کے
میں نہ بھاگوں گا کہیں جاہ و حشم سے ڈر کر
تیری آغوش میں ہی مجھ کو فنا ہونا ہے
تیرے ماتھے سے مجھے داغِ سیاہ دھونا ہے(۳۸)

میر گل خان نصیرؔ کی وطن دوستی کے بارے میں یار محمد یار لکھتے ہیں:

''گل خان نصیرؔ ایک انسان دوست شاعر ہی نہ تھا ایک سچا وطن پرست بھی تھا۔ اس نے اپنی مادر وطن سے اپنی محبت اپنی شاعری اور گیتوں میں امر کر دی ہے۔''(۳۹)

میر گل خان نصیرؔ کی ایک نظم حلف نظم ''حلف نامہ آزادی'' کے عنوان سے ہے۔ اس نظم میں میر گل خان نصیرؔ وطن سے محبت اور عقیدت کا اظہار کرنے سے پہلے اسی محبوب زمین کی مختلف شخصیات، پہاڑوں اور مناظر کی قسمیں کھاتا ہے۔ اس کی خواہش ایک خوشحال و آباد بلوچستان ہے۔ اسی خواہش کو پوری کرنے کی خاطر انھوں نے اپنی راتوں کی نیند حرام کی اور کال کوٹھڑیوں کی دیواروں کا بوسہ لیا۔ اسے اپنی تاریخ اور شخصیات کے ساتھ ساتھ سرزمین بلوچستان پر ناز ہے اور یہ سب ان کے لیے قابل عزت و تکریم اور اہم ہیں جن کو وہ مقدس جان کر ان کی قسمیں اٹھاتا ہے۔ اسے ''میر و قمبر'' کی دلیری کی کوئی اور مثال نہیں ملتی، ''عمر و مہناز'' کی محبت اسے رنگین و پاکیزہ معلوم ہوتی ہے، ''چاکر اور گوہرام'' جو کہ بلوچوں کی تاریخ کے اہم ترین اشخاص ہیں ان کی ہمت بھی قابل داد ہے، ''رند اور لاشار'' کی سی شجاعت و عزم ان کے نزدیک شاید کسی کے پاس ہو۔ ''بجار'' کی پامردی و ''میر حسن'' کی خوئے تسلیم و اخوت، ''احمد'' کا استقلال اور ''بیبو'' کی تیغ خون آشام تک ہی بات نہیں رکتی وہ ''محراب خان'' کی قربانی و ایثار کامل اور ''خونِ عبداللہ'' سے رنگین خاک کی بھی قسمیں کھاتا ہیں۔ وہ ''خداداد خان'' پر آنے والی اُس بے بسی کو بھی نہیں بھولتے، یہی وہ بے بسی ہے کہ جس نے ''خان اعظم'' سے بھی رفاقت نبھائی۔ ''احمد یار'' کے دل میں موجود ولولے کو بھی گواہ بنا کر اس کی قسم کھاتا

ہے۔ محبت کے جذبے سے سرشار میر گل خان نصیرؔ اپنی محبوبہ زمین، بلوچوں کی جائے حکومت اور مسکن اور اس زمین پر موجود درہ بولان کی چٹانوں کی بھی قسم کھاتا ہے۔ اس قسم کو مزید معتبر بنانے کے لیے وہ اس میں مولہِ کی رفعت، ریگستان کی ہواؤں، ساربانوں کی نوائے درد و فرقت، ساحل مکران کے سمندر اور 'حمل و جیئند' کی مردانہ خصلت کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اس قدر اہم اور معتبر قسم کھانے کے بعد وہ آخر میں وہ اس کا مطلب و مدعا بھی بیان کرتا ہے کہ جس کے لیے انھوں نے اپنے بلوچ و بلوچستان کی قسمیں کھائیں۔ وہ بات کچھ اس طرح ہے:

رہے گا وطن آزاد جب تک جان میں جاں ہے
یہ میرا دین ہے اے دوستو، یہ میرا ایماں ہے(۴۰)

محبوب سے وابستہ ہر چیز عاشق کے لیے اہم بن جاتی ہے اور وہ ان کی خوبصورتی اور اہمیت بیان کرتے نہیں تھکتے۔ یہی وجہ ہے کہ میر گل خان نصیرؔ نہ صرف بلوچستان سے بلکہ بلوچستان کے باسیوں سے بھی محبت کرتا ہے۔ انھیں بلوچستان کی طرح بلوچوں سے بھی محبت ہے۔ وہ بلوچ قوم کا ثناخواں ہے۔ جب بھی وہ بلوچوں کی شان میں رقم طراز ہوتے ہیں ان کا پیار جنون کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ بلوچی عظمت، ثقافت اور اشخاص ان کی نظر میں بہت اہم ہیں کیوں کہ یہ سب ان کی محبوب سرزمین بلوچستان سے جڑی ہوئیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میر گل خان نصیرؔ نے خوانین قلات جو بلوچستان کی سرزمین کے فرماں روا رہے ہیں ان کی شان میں قلم کو جنبش دیتے ہیں۔ وہ ان بہادر سپوتوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں جنھوں نے فرنگی قابضوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا اور مادر وطن کے دفاع میں لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ اس کی واضح دلیل میر گل خان نصیرؔ کی دو نظموں کے عنوانات ہیں جن میں سے ایک 'شہادت خان محراب خان' اور دوسری 'شہادت میر مہراب خان غازی' ہے۔ ان نظموں میں وہ بلوچستان کے ان بہادر خوانین کا ذکر خاص محبت کے جذبے کے تحت کرتے ہیں اور ان کو شاندار انداز میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ 'شہادت خان مہراب خان غازی' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں ان کے الفاظ کا چناؤ ان کی محبت اور جذبات کا بھرپور اظہار ہے۔ خان

مہراب خان کے دربار میں جب انگریزوں نے اپنے مندوب بھیج کر انھیں اپنے تابع رہنے کا کہا تو انھوں نے فرنگی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے لڑنے کو ترجیح دیں۔اس موقع پر جو مکالمہ ہوا اس کو میر گل خان نصیرؔ نے کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے:

جواب ان کو دیا یوں خانِ عالیشان نے تن کر
''تم آئے ہو یہاں شیطان کی صورت دغا بن کر
میں ہوں احمد زئی اور شرم ہے میرے لیے آنا
ترے لعنت بھرے در پر سبک سر بن کے جھک جانا
وطن یہ ہے ہمارا سن گھمنڈی مست و دیوانا
تو اپنی فوج لاتعداد و اسلحہ پہ نہ اترانا
ہمارے واسطے آسان ہے سر سے گزر جانا
اگر لڑنے کی خواہش ہے بلوچوں سے، چلے آنا
نہ رہ جائے یہ حسرت دل میں دو دو ہاتھ کر جانا''(۴۱)

اس بند سے خان قلات کا جواب اور میر گل خان نصیرؔ کا ان کی اس بہادری پر فخر واضح طور پر عیاں ہو جاتا ہے۔اسی طریقے سے جب دوسری نظم میں خان مہراب خان کی شہادت اور احوال لکھتے ہیں تب وہ ان بلوچ فرزندوں کو شیر سے تشبیہ دیتے ہیں، ان سے اپنی محبت کا اظہار اور فرنگی دشمن سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔اس موقع پر حب وطن سے سرشار ہو کر وہ خود کو اس معرکے کا گواہ بناتے ہیں۔ان کو خان کی شہادت کا افسوس بھی ہے اور اس شہادت پر فخر بھی ہے۔ نظم ''شہادت میر محراب خان غازی'' میں لکھتے ہیں:

شہید قوم محراب خان سرگرم سخن بیٹھے
اور اس کے گرد صف باندھے بلوچی تیغ زن بیٹھے
اتنے میں فرنگی فوج میری میں نکلتی ہے
بلوچی سوراؤں پر ابھی شمشیر چلتی ہے
اہلِ مجلس سونت کر شمشیر بڑھتے ہیں
وطن کے دشمنوں سے شیر کی مانند لڑتے تھے

کسی کو کاٹتے ہیں اور کسی سے خود بھی کٹتے ہیں
بمثلِ شیر دراں ہر فرنگی پر جھپٹتے ہیں
کسی پر بھی نہیں رکتی ہے محراب خان کی شمشیر
مقابل ہو رہی ہے کفر سے ایمان کی شمشیر
فرنگی فیر کرتے ہیں، بلوچی گر کے بڑھتے ہیں
وطن کے نام پر یہ تیغ زن قربان ہوتے ہیں
خدا کے پاک بندے صاحبِ ایمان ہوتے ہیں (۴۲)

نوشکی کے صحراؤں کی وسعت میں آنکھیں کھولنے والا شاعر میر گل خان نصیرؔ ایک دور اندیش رہبر ہے جو قوم کے مستقبل کے حوالے سے ہر وقت فکر مند نظر آتے ہیں اور معماران قوم کو جگانے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر ڈھوتے نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ نیند سے اُٹھ کر بے چین دکھائی دیتے ہیں تو کبھی عالم ہوش میں بے اختیار دستِ دعا بلند کر کے گڑگڑاتے ہیں کہ خالقِ کائنات خوابِ خرگوش میں مست اس کی قوم کو بیدار کرے۔ وقت جو کسی کا انتظار نہیں کرتا اس کے ساتھ ہم قدم ہونے کے لیے میر گل خان نصیرؔ اپنے نوجوانوں کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ قلم کو جب بھی جنبش دیتے ہیں تو قوم کا درد انگ انگ میں اٹھتا ہے اور اس درد کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔ شاعری بھی ایسی ہے کہ جس میں پورا عہد نظر آتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ادب سماجی عمل کا اہم جز ہے۔ وہ جس سماج میں سانس لے رہے تھے وہاں اپنے حقوق مانگنے کا دوسرا نام اپنے لیے آفت پیدا کرنا تھا۔ ایک ایسے سماج میں جہاں زبانیں کٹی ہوئیں اور قلم بکے ہوتے تھے، جہاں سانسوں پر پہرے تھے، جہاں تقدیر پر راضی بہ رضا رہنا ہی عقل مندی تصور کی جاتی تھی ایسے سماج میں روایات اور ظلم کا یہ باغی شاعر بغاوت پر اُتر آیا اور تقدیر کو بلائے آسمان ماننے سے انکار کیا۔ وہ وقت کے لاتوں مناتوں کے سامنے رسم ابراہیمی ادا کرنے والا مجاہد بن کر کھڑا ہوا اور اپنے قلم سے جبر و قہر اور استحصال کے بتوں کو اوندھے منہ گرانے لگا۔ آموزشِ آدم نو کے لیے ایک تازہ جہاں آباد کرنے کی خواہش رکھنے والے میر گل خان نصیرؔ نے کبھی بھی یزیدی طاقتوں کی خدائی کو قبول نہیں کیا اور نہ ہی کوفہ والوں کے راستے پر گئے۔ بلکہ اس کے مقابلے میں اپنی شاعری کے ذریعے وقت کے ہر

یزید و شمر کے سامنے اہل بیت کی روایات کو زندہ رکھا۔ باطل کو حق کے سامنے جھکنا ہی پڑتا ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ حرکت و عمل کا سلسلہ جاری رہے۔ میر گل خان نصیرؔ اپنے نوجوانوں سے حوصلے کا طالب تھا۔ وہ نوجوانوں کو واسطے، طعنے، غیرت دے کر اور مختلف نفسیاتی حربوں کے ذریعے اُبھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں اپنے نوجوانوں کی تن آسانی رُلاتی تھی اس لیے وہ انھیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ مادرِ وطن کو فرنگی کے چنگل اور اپنوں کی قید سے آزاد کر سکے۔

انگریز کے جوتے چاٹنے سے جیسے ہی قوم کو نجات ملی تو سرداروں نے فوراً قوم کے سامنے اپنا ہاتھ بوسہ تعظیم کے لیے بڑھایا جو پہلے اغیار کے پنجے کے نیچے تھے اب وہ سردار کے شکنجے میں آگئے تھے۔ آزادی کے نام پر محض غلامی کی زنجیروں میں تبدیلی آئی تھی پہلے فرنگی کے بیڑیاں پاؤں میں تھیں اب سردار کا طوقِ غلامی' گلے میں پڑ گیا تھا۔ جرگے کے نام پر تذلیل کرنا عام روش بن گئی۔ قلم کو پابند کر کے نطق و لب کے دستور شاہی بالا خانوں میں بننے لگے تھے۔ لیکن فیض احمد فیضؔ سے فیض حاصل کرنے والے میر گل خان نصیرؔ نے فیضؔ کی طرح اس صبحِ بے تجلی کو ماننے سے انکار کیا، وطن کی بے رنگ بہاروں کو قبول کرنے کی بجائے عشق وطن میں ڈوب کر وطن کو یرغمال بنانے والے عناصر کے خلاف قلم سے جہاد جاری رکھا۔ وطن کے رخِ زیبا پر اپنوں کے طمانچے دیکھ کر ان کے دل میں درد کی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ عشقِ وطن نے اسے بلوچستان کا حمزہ توف بنایا۔ نہ صرف وطن بلکہ شہدائے وطن، بہادران قوم اور اسلاف کی گراں قدر قربانیوں کو یاد کر کے نئی نسل کو ان سے آشنا کیا۔ انھوں نے یادِ رفتہ کی صورت گم ہونے والے اسلاف کو شاعری کے ذریعے زندہ کر کے قوم کی تاریخ پر احسان کیا۔

میر گل خان نصیرؔ نے ایک ایسے دور میں رہبری کا فریضہ سرانجام دیا کہ جس وقت قوم منزل سے بھٹک سکتی تھی، ان کی آواز اپنے ہمعصروں میں سب سے توانا آواز تھی۔ انھوں نے نہ صرف نئی نسل کو جگایا بلکہ ان کی تربیت کر کے انھیں منزل کا ادراک دلایا۔ آج میر گل خان نصیرؔ کی متعین راہوں پر چل کر بلوچ قوم اور بلوچستان اس مقام پر پہنچے ہیں کہ ان میں اپنے حق کو مانگنے کا شعور پیدا ہوا ہے۔ میر گل خان نصیرؔ کی شاعری آج

بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی ان کے اپنے عہد میں تھی۔ اگر ان کی شاعری کی طرف نوجوان طبقہ متوجہ ہو اور ان کے افکار و تصورات پر عمل کرے تو وہ وقت دور نہیں کہ نوجوان اصل معنوں میں ملک و قوم کے روحِ رواں بنیں گے۔ میر گل خان نصیرؔ کی شاعری ہر نوجوان اور خصوصاً بلوچ نوجوانوں کے لیے نصب العین کا تعین کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک خوددار زندگی جینے کا سبق ہے اور سچائی کا درس ہے۔ میر گل خان نصیرؔ کا فلسفہ محنت اور حوصلے کا فلسفہ ہے۔ ان کے نزدیک ہمت اور محنت وہ ہتھیار ہے کہ جس کے ذریعے ترقی کے سفر میں راہیں نکالی جاسکتی ہیں۔ ان کا اولین مخاطب قوم کا نوجوان طبقہ تھا جو کسی بھی قوم کے لیے سرمایہ سے کام نہیں ہوتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی فکر کو سمجھا جائے، ان سے استفادہ کیا جائے اور نوجوانوں کو میر گل خان نصیرؔ شناسی کا درس دیا جائے۔

حوالہ جات:

۱۔ عبدالصبور بلوچ، ڈاکٹر، ورثہ (نصیریات)، (کوئٹہ: بلوچی اکیڈمی، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۶۔

۲۔ گوہر ملک، دیباچہ ''دوستین وشیرین''، (مصنف: میر گل خان نصیرؔ)، ص: د۔

۳۔ شاہ محمد مری، میر گل خان نصیرؔ: عشاق کے قافلے، (کوئٹہ: میر گل خان نصیرؔ چیئر، یونیورسٹی آف بلوچستان، ۲۰۱۵ء)، ص ۲۷۔

۴۔ نصیرؔ، میر گل خان، ادبار کی چھاؤں میں، (کوئٹہ: میر گل خان نصیرؔ چیئر، یونیورسٹی آف بلوچستان، ۲۰۱۴ء، ص ۲۷۔

۵۔ نصیرؔ، میر گل خان، کارواں کے ساتھ، (کوئٹہ: میر گل خان نصیرؔ چیئر، یونیورسٹی آف بلوچستان، ۲۰۱۵ء)، ص ۳۴۔

۶۔ نصیرؔ، میر گل خان، ادبار کی چھاؤں میں، ص ۷۱: ۷۲۔

۷۔ گوہر ملک، ''بابا''، مشمولہ: رسالہ بلوچی دنیا، ملتان، دسمبر، ۱۹۸۴ء، ص ۱۶۔

۸۔ نصیرؔ، میر گل خان، کارواں کے ساتھ، ص ۵۸۔

۹۔ ایضاً، ص ۷۰۔

۱۰۔ ایضا، ص۶۰۔

۱۱۔ ایضا، ص۶۱۔

۱۲۔ ایضا، ص۱۲۳۔

۱۳۔ ایضا، ص۱۲۴۔

۱۴۔ عبدالصبور بلوچ، ڈاکٹر، ورثہ (نصیریات)، ص۲۷۱۔

۱۵۔ نصیرؔ، میر گل خان، کارواں کے ساتھ، ص۹۷۔

۱۶۔ ایضا، ص۱۲۸۔

۱۷۔ ایضا، ص۱۴۴۔

۱۸۔ ایضا، ص۱۱۰۔

۱۹۔ شاہ محمد مری، میر گل خان نصیرؔ: عشاق کے قافلے، ص۲۴۔

۲۰۔ نصیرؔ، میر گل خان، کارواں کے ساتھ، ص۳۴۔

۲۱۔ ایضا، ص۳۴۔

۲۲۔ ایضا، ص۶۱۔

۲۳۔ ایضا، ص۷۵۔

۲۴۔ ایضا، ص۷۶۔

۲۵۔ گوہر ملک، '' ہمارے پیارے بابا''، مشمولہ: میر گل خان نصیرؔ: بلوچ شاعر، مورخ، صحافی و سیاستدان، (کوئٹہ: میر گل خان نصیرؔ چیئر، یونیورسٹی آف بلوچستان، ۲۰۱۴ء)، ص۳۷۔

۲۶۔ نصیرؔ، میر گل خان، کارواں کے ساتھ، ص۱۰۶:۱۰۷۔

۲۷۔ ایضا، ص۷۷۔

۲۸۔ ایضا، ص۱۰۸۔

۲۹۔ ایضا، ص۶۷۔

۳۰۔ ایضا، ص۶۹۔

۳۱۔ شاہ محمد مری، میر گل خان نصیرؔ: عشاق کے قافلے، ص۱۱۳۔

۳۲۔ ثناء بلوچ، ''گل خان نصیر اور مزاحمتی ادب''، مشمولہ: میر گل خان نصیرؔ:بلوچ شاعر، مورخ، صحافی و سیاستدان، ص۲۰۸۔

۳۳۔ ایضاً، ص۲۰۷۔

۳۴۔ نصیرؔ، میر گل خان، کارواں کے ساتھ، ص۱۱۴۔

۳۵۔ ایضاً، ص۱۱۵۔

۳۶۔ عبدالصبور بلوچ، ڈاکٹر، ورثہ(نصیریات)، (کوئٹہ: بلوچی اکیڈمی، ۲۰۱۶ء)، ص۱۶۱۔

۳۷۔ نصیرؔ، میر گل خان، کارواں کے ساتھ، ص۸۷۔

۳۸۔ ایضا, ص۸۸۔

۳۹۔ یار محمد یار، ''جدید بلوچی شاعری کا میر کارواں''، مشمولہ: میر گل خان نصیرؔ:بلوچ شاعر، مورخ، صحافی و سیاستدان، ص۱۵۳۔

۴۰۔ نصیرؔ، میر گل خان، کارواں کے ساتھ، ص۱۱۲۔

۴۱۔ ایضا، ص۴۲۔

۴۲۔ ایضا، ص۴۸۔